Fikr-o-Nasar (Islamabad) 3:7-8 (1966)

قرآن حکیم اور نظام حکومت

شیخ محمد عثمان
پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

اسلام میں دین و سیاست ایک ہیں بھی اور نہیں بھی ۔ جہاں تک روح دین کا تعلق ہے، مسلمانوں کی سیاست اس سے الگ نہیں رہ سکتی مگر جہاں تک ایک جدید سوسائٹی کے آئین و انتظام کی جزئیات کا تعلق ہے ، اگر ہم انہیں قرآن و سنت میں ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو یہ کوشش لا حاصل بھی ہوگی اور شاید غیر مستحسن بھی ۔ قرآن حکیم نے انفرادی اور اجتاعی زندگی کے چند موٹے موٹے قاعدے بتادئے ہیں ۔ وہ ان کی تفصیلات میں نہیں جاتا ۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے ۔ اس سے ہماری ایک حد تک خود مختارانہ، حیثیت کا ثبوت مہیا ہوتا ہے ۔ قرآن مجید میں کچھ معاشی اصول بھی بیان ہوئے ہیں اور کچھ سیاسی یا ملکی ضوابط بھی ۔ مگر جدید معنوں میں قرآن کا اپنا کوئی (قطعی) معاشی یا سیاسی نظام نہیں ہے ۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی یا معاشی نظام کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ عام اصولوں کی روشنی میں وقت اور حالات کے مطابق ہر زمانے اور ہر دور میں ہمیں اپنا معاشی اور سیاسی نظام خود تجویز و تعمیر کرنا چاہئے۔ اسلام نہ قطعی جمہوریت ہے، نہ بادشاہت اور نہ آمریت۔ اسی طرح جدید اصطلاحی زبان میں وہ نہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، نہ اشتالی اور نہ اشتراکی، '' اسلامی '' نظام تو در اصل قرآنی احکام کی روح اور روح عصر کو تطبیق دینے سے تیار ہوتا ہے ۔

' روح عصر ' سے میری مراد زمانے اور وقت کا ہر اچھا برا رجحان نہیں۔ اس سے مراد وہ انسانی قدریں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ نسل آدم پر آشکار یا منکشف ہو رہی ہیں ۔ مثال کے طور ایک زمانہ میں ''غلامی'' کا عام رواج تھا ۔ اسلام نے بھی اس کی ایک ہلکی سی صورت گوارا کرلی مگر اب کسی

مذہب سوسائٹی کا ضمیر اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ہی نہیں عالم اسلام سے بھی غلامی کا دستور ناپید ہوچکا ہے۔ عورت کو سوسائٹی میں ایک پورے فرد کی حیثیت دینے کا خیال بھی 'روح عصر' کی ذیل میں آتا ہے۔ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں جو انسانی قدریں قوت کے ساتھ ابھری ہیں، ان میں مزدور اور کسان سے ہمدردی، دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنے کا رجحان اور ہر ملک اور طبقے کا دوسروں کے معاشی اور سیاسی استحصال سے محفوظ رہنے کا شعور بہ طور خاص اہم ہیں۔

قرآن حکیم انسانی زندگی کے لئے کامل نسخۂ ہدایت ہے۔ مگر اس معاملے میں اس نے نہایت با معنی اور حکیمانہ سکوت اختیار کیا ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح کا نظام مملکت — جمہوریت، بادشاہت یا آمریت — اختیار کرنا چاہئے۔ آپ کہیں گے امرھم شوری بینھم سے کیا جمہوری نظام سلطنت مراد نہیں؟ تو میں کہوں گا کہ بادشاہت بھی تو شوریٰ پر مبنی ہوسکتی ہے اور آمریت بھی کچھ اس اصول کے قطعی منافی نہیں۔ مثال کے طور پر افغانستان یا ایران کی بادشاہت اور مصر میں (بالخصوص چند سال پہلے کی) جمال عبدالناصر کی صدارت کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ دونوں شوریٰ کے بغیر نہیں۔ لیکن فرض کیجئے میں یہاں آپ سے اتفاق کرتا ہوں تو سوال پیدا ہوگا کہ اسلامی جمہوریہ میں مشورہ یا رائے دینے کا حق کسے حاصل ہے؟ کیا مملکت کے علماء و فضلاء کو اور فقط ان لوگوں کو جنھیں امور سلطنت کا کچھ فہم و شعور ہو یا ملک کے ہر بالغ مرد و عورت کو؟ پھر کیا خلیفہ یا صدر کا انتخاب ایک مقررہ مدت کے لئے ہوگا یا ایک بار کا چنا ہوا صدر تاحین حیات اپنے منصب جلیلہ پر فائز رہے گا؟ کیا اسلامی جمہوریہ میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں اپنا وجود اور اپنی سرگرمیاں قائم رکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ اگر مملکت ایک سے زیادہ حصوں پر مشتمل ہو تو کیا وہ وحدانی طرز حکومت اختیار کرے گی یا وفاق؟ قانون ساز ادارہ ایک ایوانی ہوگا یا دو ایوانی؟ اسلامی جمہوریہ میں صدارت اور وزارت عظمیٰ کے الگ الگ منصب ممکن ہیں یا نہیں؟ نظم و نسق کی باگ ڈور کابینہ اور اس کی وساطت سے مقننہ کے ہاتھ میں ہوگی یا سربراہ مملکت کے ہاتھ میں؟

یہ اور اس قسم کے بیسیوں دوسرے اساسی سوالات ایسے ہیں کہ ان کے واضح تصور کے بغیر کسی جمہوریہ کے خد و خال نمایاں نہیں ہوسکتے اور اسے دیگر نظام ہائے سیاسی یعنی آمریت یا ملوکیت سے الگ اور متمیز نہیں کیا جاسکتا اور قرآن حکیم نے ان تمام امور میں حکیمانہ سکوت اختیار کیا ہے -

اب ایک اور پہلو پر غور کیجئے - آپ جانتے ہیں کہ قرآن حکیم وضو کے بارے میں فقط اتنا کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتا کہ مسلمانو! نماز کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے منہ دھو لیا کرو بلکہ کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے کا حکم دیتا ہے - یہی نہیں وہ اور زیادہ تفصیلات میں جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر کسی مسلمان پر غسل واجب ہے اور اسے پانی نہیں ملتا، ادھر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے کا وقت قریب آرہا ہے تو وہ کیا کرے - یہ بات بظاہر معمولی سی معلوم ہوتی ہے مگر قرآن حکیم ہمیں واضح طور سے بتاتا ہے کہ ہمیں پاک و صاف مٹی سے تیمم کرنا چاہئے- پھر ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید یہ نہیں بتاتا کہ ہم جب اپنی مملکت قائم کریں تو رائے فقط پڑھے لکھوں کی پوچھیں یا سلطنت کے اندر بسنے والے ہر بالغ شخص کی ؟-

اقامت نماز کے لئے قرآن حکیم میں بار بار تاکید فرمائی گئی ہے - اسے نیکی کی راہ دکھانے والی اور برائیوں سے روکنے والی بتایا گیا ہے - اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کی صلاح دی گئی ہے - اسے وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے کو کہا گیا ہے - اس سے پہلے وضو یا تیمم کو ضروری قرار دیا ہے- اس کے ضائع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا - عین حالت جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑا ہو اور نماز کا وقت آجائے تو خدا کے نام پر لڑنے والے کس طرح فریضہ نماز ادا کریں، قرآن حکیم اس کی بھی وضاحت کرتا ہے مگر اس معاملے میں وہ پھر خاموش ہے کہ صدر مملکت کو عمر بھر کے لئے انتخاب کیا جائے یا ایک مقرر مدت کے لئے -

روزہ فرض ٹھہراتے وقت یہ بتایا گیا ہے کہ یہ عبادت تم پر ہی نہیں، تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض تھی- پھر روزے کا حکم سنا کر اسکی حکمت و خیر کو بیان کیا گیا ہے - پھر انسان کی مختلف حالتوں میں اس کی فرضیت میں جو

جو تبدیلی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے - پھر سحری اور افطار کے اوقات نہایت واضح طریق سے بیان ہوئے ہیں مگر اس سوال پر کہ اسلامی مملکت میں صدر اور وزیر اعظم دو الگ الگ افراد ہوں کہ نہ ہوں یا کابنیہ ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو یا صدر مملکت کے سامنے ، قرآن حکیم کچھ نہیں کہتا -

اسی طرح یہ صحیفہ آسمانی نکاح و طلاق اور مہر وغیرہ کی کتنی ہی تفصیلات بیان کرتا ہے - وراثت میں ایک ایک حقدار کا حق اور حصہ مقرر کرتا ہے - یہی نہیں بلکہ وہ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے واضح اور قطعی احکام نافذ کرتا ہے - مثال کے طور پر اگر کوئی شخص غصے یا برافروختگی کے عالم میں بیوی کو ماں کہہ دے اور بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ معاملے کو رفع دفع کرنا چاہے تو قرآن حکیم اس کے لئے ایک خاص دستور مقرر کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے شخص کو اول تو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا - اگر وہ غلام نہیں رکھتا تو پھر اسے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے تاکہ اسے اپنے جذبات پر قابو پانے کی تربیت حاصل ہو اور اگر وہ روزے بھی نہ رکھ سکتا ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے - (سورۃ المجادلہ :۳-۴) لیکن قرآن حکیم اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ اسلامی مملکت میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کا وجود ممکن ہے کہ نہیں ہے -

(۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن حکیم نے ان اہم دستوری اور آئینی معاملات میں ہمیں کیوں کوئی واضح حکم نہیں دیا حالانکہ یہ معاملات وہ اہم سیاسی مسائل ہیں جن کو تسلی بخش طور سے حل کئے بغیر ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی -

در اصل وحی اور رسالت کی غرض و غائت انسان کے اندر ہستی باری تعالیٰ کا شعور بیدار کرکے اس کے کردار میں خدا شناسی اور حق پسندی ، بے نفسی اور پاک بازی ، شجاعت اور مردانگی کے جوہر پیدا کرنا ہے - اس مقصد کے لئے جو جو باتیں بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی تھیں اور جن کا تعلق ہماری نفسی

اور اخلاقی زندگی سے براہ راست اور مستقلاً تھا، ان میں سے ایک ایک کا قرآن حکیم نے ذکر کیا اور اس کے بارے میں ہماری واضح رہنمائی فرمائی ہے مگر جو باتیں اس مقصد و غایت کے لحاظ سے بنیادی اور اساسی نہ تھیں اور جن کے تقاضے اور مطالبے وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے والے تھے۔ ان کو ہماری عقل و بصیرت اور فہم و فراست پر چھوڑ دیا کہ ہم انہیں اپنے طور پر طے کریں۔ یہی باعث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کے وقت ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جو ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ مسئلے کو وحی کے ذریعے سے طے کرنے کرانے کے آرزو مند تھے اور قرآن حکیم نے صاف صاف لفظوں میں ان کی اس روش کو ضرر رساں اور نا عاقبت اندیشانہ قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

یآیھاالذین امنوا لاتسئلوا عن اشیآء ان تبد لکم
تسؤکم وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم
عفا اللہ عنھا واللہ غفور حلیم قد سالھا قوم من قبلکم
ثم اصبحوا بھا کفرین (المائدہ: ۱۰۱ - ۱۰۲)

"مومنو! ایسی چیزوں کی بابت نہ پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہارے لئے باعث تکلیف ہوں اور ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے اگر تم ان کے متعلق سوال کروگے تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری پہلی پوچھ گچھ معاف کردی ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بردبار ہے۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسی باتیں پوچھیں، پھر وہ ان سے رو گردان ہوگئے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہر بات میں ہم کو قطعی حکم دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ اصولی باتیں بیان کردینے کے بعد ہماری عقل و دانش کی کار گذاریوں کے لئے زیادہ سے زیادہ وسیع میدان چھوڑ دیتا ہے کہ بصورت دیگر بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونا ہمارے لئے از حد دشوار شاید ناممکن ہوجاتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم آیات بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں "فرمایا دین حق یہ نہیں چاہتا کہ انسانی معیشت کے لئے سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کردے

اور تمہارے ہر عمل کو کسی نہ کسی پابندی سے ضرور ہی باندھ دے۔ جو کچھ ضروری تھا، بتلا دیا گیا، جو چھوڑ دیا، وہ معاف ہے۔ اب تم اپنے جی سے کاوشیں کرکے طرح طرح کے سوالات مت کرو، اگر کروگے تو دین میں آسانی کی جگہ تنگی و مشقت پیدا ہوجائے گی"۔ (ترجمان القرآن، جلد اول : ۳۳۴)

ہمارے یہاں ماضی قریب میں بعض علماء کرام نے اس خیال سے بے حد فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام پوری زندگی کے لئے ایک معین ضابطہ اور نظام حیات ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام دین و دنیا کے امور میں اس طرح کی تفریق نہیں کرتا جس طرح بعض راہبانہ قسم کے مذہبی گروہ روا رکھتے ہیں مگر وہ امور زندگی کو من حیث المجموع دو حصوں میں ضرور بانٹ رہا ہے۔ میرے نزدیک آج کے حالات میں دین و دنیا کی یکجائی کے مقبول عام تصور کو جان لینے کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام معاملات انسانی میں ایک خاص طرح کی بانٹ یا تمیز روا رکھتا ہے۔ اور بانٹ یا تمیز یہ ہے کہ دین و دنیا کے ایک معاملات تو وہ ہیں جن کو قرآن حکیم نے اپنا موضوع بنایا ہے، جن کے حق و ناحق اور نیک و بد پر روشنی ڈالی ہے اور جن کی ہر پیچ راہوں میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور دوسری قسم کے معاملات و مسائل وہ ہیں جن کے بارے میں اس نے حکیمانہ سکوت برتا ہے اور خود ہم کو کرید کرید کر پوچھنے اور یوں اپنے آپ کو پابند بنانے سے منع فرمایا ہے۔

اس سے لا محالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے اور خود آیات بالا کا واضح منشا بھی یہی ہے کہ جو کچھ قرآن حکیم میں بیان ہوگیا، اس کے تو ہم پابند ہیں اور مسلمان ہوتے ہوئے اس سے روگردانی نہیں کرسکتے مگر جو امور قرآن میں بیان نہیں ہوئے، دوسرے لفظوں میں جن کو اس نے بر بنائے حکمت نظر انداز کیا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہو رہے ہیں تو ان کو طے کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔

معاملات زندگی کے مابین اس اسلامی تفریق کو ایک اور انداز سے بھی ذہن نشین کیا جاسکتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کے

دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس کے تقاضے ہر حال اور ہر زمانے میں اپنی اصل پر قائم رہتے ہیں ۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے، جس کی ضروریات اور مقتضیات عہد بہ عہد اور نو بہ نو بدلتی رہتی ہیں ۔ مثال کے طور پر جنسی آلودگی اور مال و دولت کی حریصانہ چاہت کو دیکھئے کہ ہر زمانے اور ہر عہد میں یہ انسان کی پاکیزہ خوشیوں اور حقیقی مسرتوں کے لئے سم قاتل رہی ہیں۔ نسل آدم خواہ کتنی ہی ترقی کرجائے اور علم و سائینس میں وہ کیسے ہی کمالات کر دکھائے، اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا جو تعلق جنسی آلودگی اور مال و دولت کی حریصانہ چاہت سے اول روز بندھ گیا ہے ، اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ قیامت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جب یہ قباحتیں انسانی روح کو مریض اور ضعیف کرنے کی بجائے اس کی ترقی اور صحت کی ضامن بن جائیں۔ یہی حال خدا پرستی اور خدا جوئی کا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جو اثر ان باتوں کا انسانی زندگی پر پڑتا تھا، بعینہ وہی اثر آج بھی پیدا ہوتا ہے اور ہزاروں سال بعد بھی ویسا ہی اثر پیدا ہوگا۔ اسی طرح ایک طرف جھوٹ، مکر و فریب، فتنہ پردازی ، ظلم و جور اور بد دیانتی کو دیکھئے اور دوسری طرف سچ بولنے، حق و انصاف کا ساتھ دینے، والدین اور عزیز و اقارب سے نیک سلوک کرنے، مصیبت میں دوسروں کے کام آنے اور ازدواجی زندگی کو عدل و مروت کی بنیاد پر استوار کرنے پر غور کیجئے ۔ یہ مسائل و معاملات ایسے ہیں کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ان کی حقیقت و حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ یہ امور انسانی زندگی میں ایک مستقل اور غیر متغیر جگہ رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ہماری معیشت کے کچھ پہلو ایسے ہیں جن کا یہ حال نہیں جن کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ جن کی افادیت اور عدم افادیت وقت اور حالات پر موقوف ہے ۔ جن میں تغیر و تبدل ناگزیر ہے ۔ جو آج ایک حالت پر ہیں تو کل دوسری پر ۔ لباس، زبان، طرز رہائش، فن تعمیر، زراعت اور صنعت و حرفت سائینسی اکتشافات اور نظام تعلیم یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کو ایک حال پر قرار نہیں ۔ پہلا حصہ ہماری نفسی، اخلاق اور منزلی زندگی کے ابدی مسائل و حقائق سے وابستہ ہے ۔ دوسرا حصہ ہردم تغیر اور ارتقاء پذیر شعبہ ہائے تمدن پر مشتمل ہے ۔ پہلا حصہ قرآن کا موضوع ہے اور دوسرا حصہ پر بنائے حکمت ہمارے فہم و تدبر پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ طرز حکومت کس حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے تصریحات بالا کے بعد اس سوال کے جواب میں چنداں دقت باقی نہیں رہتی - طرز حکومت بلا شبہ تغیر پذیر تمدن کا ایک شعبہ ہے - اس کی سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ قرآن حکیم ان تمام سوالات کے بارے میں مسلمانان عالم کی بھلائی ہی کے لئے خاموش ہے جو میں نے مضمون کی ابتدا میں اٹھائے ہیں اور جو اس ضمن میں مزید اٹھائے جاسکتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی متعدد دلائل اس کے حق میں پیش کئے جاسکتے ہیں -

(۳)

آج ہر تعلیم یافتہ مسلمان اور قابل ذکر عالم دین ایمان کی حد تک اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن جمہوری نظام حکومت کی تعلیم دیتا ہے اور ملوکیت کا سخت مخالف ہے لیکن کیا ملوکیت وہی نظام نہیں جو صدیوں ہم میں رائج رہا ہے اور جس کے سائے میں بڑے بڑے آئمہ دین، مجددین اور محدثین پروان چڑھے - بلکہ خود سلسلۂ سلاطین میں سے عمر بن عبدالعزیز، صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے شہنشاہ بھی ہوئے ہیں جن کی زندگیاں دینداری اور پرہیز گاری کی عظیم مثالیں ہیں اور جن کے دم سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا -

اس دلیل کے خلاف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ سب بزرگ انسان ہوتے ہوئے غلطی کرسکتے تھے اور اس بات کا امکان ہر وقت ہے کہ کوئی عالم دین یا بہت سے علمائے دین تھوڑے یا ایک لمبے عرصے کے لئے قرآن حکیم کے کسی پہلو کو سمجھنے میں ٹھوکر کھاجائیں - لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ کسی زمانے میں خود پیغمبر بادشاہ ہوئے ہیں - حضرت داؤد علیہ السلام جن کے کردار و ایمان کی قرآن میں کئی جگہ تعریف ہوئی ہے نہ صرف خود بادشاہ تھے بلکہ خاندانی بادشاہت کے طرز پر ان کے بعد ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ وارث تخت و تاج بنے اور بڑے جاہ و جلال اور کروفر کے ساتھ انھوں نے حکمرانی کی - اس بادشاہت کو اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے دونوں پر اپنی خاص بخشش و رحمت قرار دیا ہے -

قرآن میں بیان کردہ ایک اور واقعہ سے بھی ملوکیت کے ادارہ کو براہ راست تائید و نصرت خداوندی حاصل ہوئی ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کے درمیان ایک نبی کی واجب التسلیم ذات موجود تھی، انہوں نے ایک بادشاہ کے تقرر کی خواہش کی تاکہ وہ اس کی قیادت میں دشمنوں کے خلاف لڑسکیں تو اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کیا ۔ اس کا اعلان کرتے ہوئے :

'' ان کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے ''۔ (البقرہ : ۲۴۷)

اور جب حسب عادت بنی اسرائیل نے اس نامزدگی پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تو نبیٔ وقت نے معاملے کی یوں وضاحت کی :

'' نبی نے کہا اللہ نے طالوت کو تم پر برگزیدہ کیا ہے اور علم اورجسم دونوں میں اسے برتری بخشی ہے اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے ، دیتا ہے اور اللہ وسعتوں والا اور سب کچھ جاننے والا ہے '' (البقرہ : ۲۴۷)

اب ایک طرف تو داؤد ع و سلیمانؑ اور طالوت ہیں کہ بادشاہ ہونے پر برگزیدہ ٹھہرے اور دوسری طرف رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہے کہ اس سے جمہوری اصولوں کی حمائت کا پہلو نکلتا ہے ۔ آپ ؐ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی وفات سے قبل اپنے خاندان یا قبیلہ میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ فرمایا کہ ایسا کرنا شاید آمرانہ یا ملوکانہ طرزعمل سے قریب تر ہوتا ۔ پھر حضرت عیسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر ہیں کہ خدا کے مقبول بندے اور رسول ہیں مگر نہ سلطنت کی نیو اٹھائی اور نہ طرز حکومت پر توجہ کی ۔

پیغمبران الٰہی کے طرز عمل کے اس تفاوت پر غور کیجئے کہ کسی نے ملوکیت کو اپنایا ۔ کسی نے جمہوریت کو ترجیح دی ، اور کوئی سرے سے سیاست و حکومت کے بکھیڑوں ہی میں نہ پڑا ۔ اب بتائیے کہ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟ کیا اس سے نہایت محکم اور قطعی صورت میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ طرز حکومت کے مسائل اصل دین — زندگی کے غیر متبدل حقائق — سے

تعلق نہیں رکھتے کیونکہ دین کی اصل میں پیغمبران الٰہی کے فکر و عمل کا باہمی اختلاف سلسلۂ رسالت اور روح نبوت ہی کے منافی ٹھہرے گا۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اسے یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ خود اسلام میں دین اور مملکت الگ الگ ہیں۔ لیکن یہ بیان جس قدر چونکا دینے والا ہے اسی قدر وضاحت طلب بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مخصوص انداز سے ہمارے ماضیٔ قریب میں بعض علمائے کرام دین اور مملکت کو اکٹھا کر رہے تھے اور آئین و دستور کی ایک ایک دفعہ کو کتاب و سنت سے نکالنے کی کاوشوں میں مصروف تھے اور ملکی سیاست کو اپنے فکر کا پابند بنانا چاہتے تھے، اسلام کی روح اس کے منافی ہے۔ جب خود قرآن حکیم کا نازل کرنے والا ہمیں ان امور میں پابند بنانا نہیں چاہتا اور وہ طرز حکومت اور آئین و دستور وغیرہ کے بارے میں ایک حکیمانہ سکوت پسند کرتا ہے تو پھر انسانوں کی یہ جسارت کس قدر دیدنی ہے کہ جن مسائل کا ذکر وہ کتاب و سنت میں نہیں پاتے، ان کو بزعم خویش ''کتاب و سنت کی روشنی میں'' حل کرکے اپنے اجتہادات کو عین اسلام ظاہر کرتے ہیں اور جب ان سے اختلاف کیا جائے تو اسے کفر و اسلام اور حق و باطل کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ گویا جن معنوں میں آج عالم اسلام کی بعض مذہبی تحریکیں دین و سیاست کو غیر منفک دیکھتی ہیں، ان معنوں میں وہ از روئے قرآن غیر منفک نہیں ہیں بلکہ ایسا خیال کرنا اور اس کو صحیح تسلیم کرنا اسلامی ممالک کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کرسکتا ہے اور جن لوگوں کی نظر گہری ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایسی تحریکیں اپنی انتہا پسندی اور نظریاتی تشدد کے باعث ہر جگہ ترقی کی راہ میں حائل ہوتی رہی ہیں۔

(۴)

لیکن ایک اعتبار سے اسلام میں سیاست دین کی پابند ہے۔ دین مختصراً دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اول کائنات اور انسانی زندگی کے آغاز و انجام کا ایک نظریہ۔ دوم، ضابطۂ اخلاق و عمل۔ ان دونوں کے قبول کرنے یعنی نظریے پر یقین رکھنے اور ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنے سے ہمارے اندر وہ سیرت پیدا ہوتی ہے جو مقصود وحی اور غائت رسالت ہے۔ قرآن نے جو ضابطۂ اخلاق

دیا ہے، انفرادی زندگی میں اس کی روح پاکبازی اور تقویٰ ہے اور اجتماعی زندگی میں اس کی روح عدل و انصاف ہے ۔ اسلام میں سیاست ان معنوں میں دین کی پابند ہے کہ اسے عدل و انصاف کا پابند ہونا چاہئے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ عدل و انصاف جن سیاسی معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کا تقاضا کرے، اُن کو اسے اختیار کرنا چاہئے۔ اقبال کے جس مصرع سے بعض حلقوں نے جی بھرکر فائدہ اٹھایا ہے اور جس میں انہوں نے دین سے سیاست کی جدائی کو '' چنگیزی '' قرار دیا ہے، اس کا مطلب بھی دراصل یہی ہے کہ ریاست اور سیاست کو حق و انصاف کا پابند ہونا چاہئے — ورنہ اقبال نے خود ایک مقام پر اس امر کا اعتراف کیا ہر کہ اسلام کے نظام تمدن میں مذہب سے سیاست کو الگ رکھنے کی گنجائش موجود ہے ۔ اپنے '' خطبات '' میں وہ ترکی کی آئینی تبدیلیوں سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''There were, a short time ago, two main lines of thought in Turkey represented by the Nationalist Party and the Party of Religious Reform. The point of supreme interest with the Nationalist Party is above all the State and not Religion. With these thinkers religion as such has no independent function. The state is the essential factor in national life which determines the character and function of all other factors. They, there fore, reject old ideas about the function of state and Religion, and accentuate the separation of church and State. Now the structure of Islam as a religio-political system, no doubt, does permit such a view, though personally I think it is a mistake to suppose that the idea of state is more dominant and rules all other ideas embodied in the system of Islam.'' (Six Lectures, Lahore, 1930, Page : 215)

'' کچھ عرصہ پہلے ترکی میں دو طبقہ' خیال پائے جاتے تھے ۔ ایک کی نمائندگی نیشنلسٹ پارٹی اور دوسرے کی نمائندگی اصلاح مذہبی کی علمبردار جماعت کرتی ہے ۔ نیشنلسٹ پارٹی کی اصل دلچسپی مذہب میں نہیں بلکہ مملکت میں ہے ۔ ان مفکرین کے نزدیک مذہب بہ طور خود کسی آزاد حیثیت کا مالک

نہیں - قومی زندگی میں اصل چیز مملکت ہے، جس سے باقی امور کی حیثیت طے پاتی ہے - لہذا وہ مذہب اور مملکت کے منصب وظیفہ کے پرانے تصورات کو رد کرکے چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی پر زور دیتے ہیں - اب بطور مذہبی سیاسی نظام کے اسلام کی ہیئت بلا شبہ اس قسم کے نظریے کی گنجائش رکھتی ہے اگرچہ میری ذاتی رائے میں ایسا خیال کرنا غلط ہے کہ اسلام مملکت کے سوال کو اپنے نظام کے بقیہ امور پر حاوی سمجھتا ہے '' (خطبات، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰ صفحہ : ۲۱۵)

اپنے ایک خط میں بھی وہ ترکی کی آئنی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے بعض جذباتی علماء کی طرح کوئی فتویٰ صادر نہیں کرتے اور اس بات کو امکان سے باہر نہیں سمجھتے کہ مذہب اور مملکت کی یہ علاحدگی عالم اسلامی کے باعث برکت ثابت ہوسکتی ہے :

'' ترکوں نے جو مذہب اور مملکت میں امتیاز کرکے ان کو الگ الگ کردیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامیہ کےلئے باعث برکت ہوگا یا باعث شقاوت - ''

(اقبالنامہ ، حصہ اول، صفحہ : ۹۳)

اس سے مقصود یہ دکھانا تھا کہ اقبال جو اس عہد میں اسلامی قدروں کا سب سے بڑا مجدد ہوا ہے اور جس کے نظام فکر میں مذہب اور سیاست کی باہمی وابستگی بڑی اہمیت رکھتی ہے، ایک مفکر اور مدبر ترکی حیثیت سے ترکی کے طرز عمل کو خلاف اسلام قرار نہیں دیتا بلکہ مذہب و سیاست کی ایک گونہ روئی کے نظریے کی اسلام کے اندر گنجائش پاتا ہے -

یہ موضوع بڑی تفصیلی بحث چاہتا ہے اور ابھی بے شمار پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے مگر اس مختصر اور ابتدائی مضمون سے اتنی بات تو ضرور واضح ہوجاتی ہے کہ دین و سیاست کے باہمی تعلق میں بعض حلقوں کی طرف سے جس نظریاتی تشدد اور کٹرپن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اسلام میں اس سے کہیں زیادہ حکیمانہ وسعت اور فراخی پائی جاتی ہے -